حامد ابو النصرؒ کی یاد میں

اخوان کی داستان عزیمت کا ایک باب

اخوان المسلمون کے چوتھے مرشد عام محمد حامد ابو النصر ۲۰ جنوری ۹۶ کو ۸۳ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ اِنَّالِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ وہ مصر کے مردم خیز خطے اسیوط کے قصبے منفلوط میں فروری ۱۹۱۳ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو دینی و دنیوی لحاظ سے اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ۱۹۳۳ میں ۲۰ سال کی عمر میں وہ اخوان المسلمون میں باقاعدہ شامل ہوئے۔ وہ امام حسن البنا کے معتمد ساتھی تھے۔ غیر ملکی سفارت خانوں سے رابطہ ان کی ذمہ داری تھا۔ ۱۹۵۴ میں ناصر کے دور میں حکومت سے تصادم سے گریز کی پالیسی اختیار کی۔ اخوان پر ابتلا و تعذیب کا جو دور آیا اس میں انھیں عمر قید کی سزا دی گئی۔ انھوں نے ۲۵ سال جیل میں گزارے‘ ۱۹۸۶ میں عمر تلسانی کے انتقال پر انھیں مرشد عام منتخب کیا گیا۔ ان کے دس سالہ دور میں اخوان کی عوامی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اگر مصر کے حالیہ انتخابات آزادانہ ہوتے تو غیر ملکی مبصرین کی رائے میں اخوان حکمران پارٹی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے۔ ہم حامد ابو النصرؒ کی کتاب وادی نیل کا قافلہ سخت جان (ترجمہ: حافظ محمد ادریس) سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں جس سے اس دور کی ایک جھلک سامنے آتی ہے جب ہزاروں اخوان‘ کیا قائد اور کیا کارکن‘ سب ہی راہ حق پر استقامت کی ایسی روشن مثال پیش کر رہے تھے جیسی چشم فلک نے اس صدی میں نہیں دیکھی تھی۔ آج کے مصر میں بھی اخوان المسلمون ابتلا کے ہی ایک دور سے گزر رہے ہیں‘ اس لیے کہ ملکی اور غیر ملکی طاقتیں انھیں ان کے حق حکمرانی سے محروم رکھنے کے لیے ہر تدبیر کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ (مدیر)

۲۵ نومبر ۱۹۵۴ بروز جمعرات شام سات بجے اچانک جیل وارڈن میرے پاس آیا اور مجھے داروغہ جیل کے دفتر میں لے گیا۔ وہاں کئی افسران میرے منتظر بیٹھے تھے۔ جناب عبدالرحمن صالح پراسیکیوٹر جنرل اور کئی دوسرے تفتیشی افسران میری تفتیش میں مصروف ہوگئے۔ یہ تفتیشی نشست تقریباً بیس منٹ جاری رہی۔ جانے سے پہلے تفتیشی افسر نے مجھ سے کہا" تمھارے خلاف کوئی خاص کیس نہیں ہے‘ کیونکہ حالیہ حادثات میں تمھاری شرکت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ البتہ یہ ذہن میں

رہے کہ اس معاملہ کا حتمی فیصلہ انقلابی کونسل کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کونسل نے طے کر دیا کہ مکتب ارشاد (اعلیٰ اختیاراتی ادارہ) کے تمام ارکان پر مقدمہ چلا جائے تو تمھیں بھی عدالت میں پیش کر دیا جائے گا"۔

اتنی بات کہنے کے بعد تفتیشی افسر تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے اس نے ناصحانہ انداز میں کہا: "تمھیں بڑی آسانی سے رہائی مل سکتی ہے۔ تم بس اتنا لکھ دو کہ اس جماعت کے ساتھ تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ کہ منشیہ کے حادثہ کا ذمہ دار حسن الھضیبی ہے"۔ میں نے اسے جواب دیا: "میں یہ جھوٹی بات کیسے کہہ سکتا ہوں؟ مجھے معلوم ہے کہ حسن الھضیبی اس ملک کا سب سے بڑا قانون دان ہے اور وہ کبھی کسی کو یہ مشورہ نہیں دیتا کہ قانون کو ہاتھ میں لے لیا جائے۔ رہا جماعت سے لاتعلقی کا معاملہ تو اس کے بارے میں' میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اپنے علاقے میں جماعت قائم کرنے کے لیے میں نے خود امام حسن البنا کو دعوت دی تھی۔ سطح مرتفع کے علاقے میں جماعت کا جتنا کام موجود ہے' اسے منظم کرنے میں میرا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں اسے مروت اور مردانگی کے بھی خلاف سمجھتا ہوں کہ اس مشکل وقت میں جماعت کا ساتھ چھوڑ دوں"۔

افسر نے میری بات سن کر کہا: "معلوم ہوتا ہے تم بڑے شوریدہ سر ہو۔ لو یہ فرد جرم لے لو۔ تمھارا کیس ہفتے کے روز ۲۷ تاریخ کو سماعت کے لیے پیش ہو گا"۔

چند لمحے بعد ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور جیل افسر سے میرے بارے میں کہا "کہ اسے فوراً ہمارے حوالے کر دو"۔ میں اپنا بیگ لے کر آیا تو میرے ہاتھوں میں کڑیاں ڈال دی گئیں اور افسر مجھے جیل سے باہر لے گیا۔ جیل کے باہر دو مسلح سپاہی میرے انتظار میں تھے۔ قریب ہی ایک کار کھڑی تھی۔ مجھے کار میں بٹھا دیا گیا اور مسلح سپاہی میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ اب ہماری منزل کہاں تھی۔ راستے میں' میں نے ایک سپاہی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ مجھے جنگی جیل خانے لے جا رہے ہیں۔ پھر دونوں سپاہیوں نے مجھ سے اظہار ہمدردی کیا۔ میرے لیے دعائیں مانگیں اور میری ہمت بندھائی۔ میں نے ان کے جذبات خیر خواہی پر شکریہ ادا کیا اور ان سے پوچھا کہ وہ اس گھبراہٹ کا اظہار کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا جس جیل میں آپ کو لے جا رہے ہیں وہ جہنم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے اور ظالموں سے آپ کو نجات دلائے۔ میں ان کی بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ نہایت مختصر الفاظ میں انھوں نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

۲۵ نومبر بروز جمعرات رات کے تقریباً نو بجے ہم جنگی قید خانے کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ دروازے پر موجود محافظ سے ہمارے ساتھ آنے والے افسر نے بات چیت کی جس کی مجھے سمجھ نہ آئی۔ محافظ نے داروغہ جیل سے فون پر بات کی۔ میں نے محافظ کے یہ الفاظ سنے "ایک نظر بند دروازے پر موجود ہے اور اس کے ساتھ ایک افسر بھی موجود ہیں"۔ اس گفتگو کے بعد ہمیں جیل کے اندر جانے

دیا گیا۔ میرے کپڑوں کا بیگ ایک سپاہی نے لا کر دیا اور مجھے لانے والے افسر نے جیل حکام کے حوالے کر کے رسید لی۔ میری ہتھ کڑیاں کھولیں اور چلا گیا۔ جیل افسر نے مجھے گھور گھور کر دیکھا۔ پھر ایک مسلح سپاہی کو حکم دیا: "اسے بڑے جیل خانے میں لے جاؤ"۔ سپاہی نے مجھے حکم دیا: "چل بھئی!" اور ایک جانب اشارہ کیا۔ میں اس جانب چلنے لگا تو اس نے غلیظ گالی دے کر کہا اپنا بیگ بھی اٹھا لو۔ میں نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ سپاہی نے پیچھے پاؤں سے مجھے ٹھڈا مارا اور گالیاں دیتے ہوئے دھاڑا: "تیز تیز چلو"۔ جب میں تیز چلنے لگا تو اس نے پھر گالی دی اور کہا: "میں تمھارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔ تم کہاں بھاگے جا رہے ہو"۔ ہر بات کے ساتھ وہ مغلظات بکنا ضروری سمجھتا تھا۔ دائیں طرف مڑو..... کے بیٹے۔ جب میں دائیں طرف مڑا تو پھر اس نے ایک گالی دی اور آگے بڑھ کر میری پیٹھ پر ٹھوکر ماری۔ پھر اس نے حکم دیا "رک جاؤ"۔ جب میں رکا تو اس نے بندوق کا بٹ میری پیٹھ میں مارا اور گالی دے کر کہا "فوجی طریقے سے ہالٹ کرو"۔ پھر وہ گننے لگا "ایک .... دو....." چنانچہ میں فوجی انداز میں کھڑا ہوا۔ اب اس نے دھاڑتے ہوئے کہا: "ڈبل مارچ"۔ ڈبل مارچ کرتے ہوئے بڑے جیل خانے کے دروازے پر پہنچا۔ پھر وہاں رکنے کا حکم دیا گیا جہاں دس کے قریب فوجی جوان منتظر تھے۔ انھوں نے میرے استقبال کی تیاری کر رکھی تھی۔ میں نے اپنے لباس کے اوپر عبا پہن رکھی تھی۔ وہ نوجوان مجھ پر پل پڑے۔ مکوں، گھونسوں اور لاتوں سے میری تواضع ہونے لگی۔ ساتھ ساتھ گالیوں کی بوچھاڑ بھی جاری تھی۔ ان میں سے ایک نے مقامی لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا "یہ..... کا بیٹا اپنے ساتھ سوٹ کیس بھی لایا ہے۔ نواب صاحب چلا ہے لندن کی سیر کرنے"۔ یہ بات سن کر سب سپاہی قہقہے مارنے لگے۔ پے درپے ضربوں سے میری حالت غیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا پانی کا ایک گھڑا سامنے رکھا تھا' کہا: "اسے اٹھاؤ"۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ جب میں اسے نہ اٹھا سکا تو ایک دوسرے نے دہاڑتے ہوئے کہا: اگر تم اسے نہ اٹھا سکے تو اسے تمھارے اوپر انڈیل دیا جائے گا۔ اسی لمحے ایک آواز آئی' (اندر سے) کسی نے زور سے پکار کر کہا: "اسے اندر آنے دو۔ لاؤ لاؤ میرے پاس لاؤ"۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس نے کہا "اھلا" ۔ میں نے دل میں خیال کیا' شاید یہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گا' لیکن میں جونہی اس کی طرف بڑھا' اس نے میری گدی پر ایک زوردار مکہ رسید کیا جس سے میری ٹوپی گر گئی۔ اس نے مجھے حکم دیا: "یہاں کھڑے رہو"۔ چنانچہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسرا حکم دیا: "اپنے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لو"۔ میں نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لیے۔ ساتھ کے کمرے سے کسی کی آواز آئی: "..... کے بچے کو میرے پاس لاؤ"۔ مجھے اس کمرے کی طرف لایا گیا اور دروازے پر پیچھے سے ایسا دھکا دیا گیا کہ میں گرتے گرتے بچا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے کارندے نے مجھ سے پوچھنا شروع کیا: "..... کے بیٹے تمھارا نام کیا ہے؟ پھر ہر سوال کے ساتھ مجھے اسی خطاب سے نوازا جاتا رہا۔ تمھاری عمر کیا ہے؟ کس شہر کے رہنے

والے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟ تمھارا گھر کس سڑک پر ہے؟ میں سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ اس عرصے میں میرے ننگے سر پر ایک سپاہی مسلسل کوڑے سے ضرب لگاتا رہا۔ اس ظلم و ستم اور مار پیٹ کی تکلیف کئی سالوں تک میں محسوس کرتا رہا۔ پھر ان لوگوں نے میرے بیگ کی تلاشی لی اور اس میں قرآن مجید اور امام غزالی کی "احیائے علوم الدین" کو دیکھا تو تمسخر کے انداز میں کہنے لگے: "یہ عالم بنتا ہے مگر ہے نرا جاہل"۔ پھر مجھے سیل میں بند کرنے کا حکم صادر ہوا۔ ایک فوجی جوان جیل کی تیسری منزل پر مجھے لے گیا اور چکی نمبر ۲۴۲ میں داخل کر دیا۔ اس چکی میں موجود سب لوگ گھبرائے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ جیلر نے ان سب کو گالی دے کر کہا: "یہ تمھارے ساتھ رات رہے گا" اور مجھے کہا: "لے ..... کے بیٹے سمجھ گئے ہو"۔ پھر اس نے دروازہ بند کیا اور تالا لگا کر چلا گیا۔ چکی میں سات افراد موجود تھے اور وہ سب "امبابہ" کے اخوان تھے۔ انھوں نے میرے ساتھ پوری ہمدردی اور غمگساری کا مظاہرہ کیا اور میری حالت دیکھ کر سب غمزدہ ہو گئے۔ پھر مجھے تسلی دی اور حوصلہ دلانے لگے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی بھی سنائی۔ ان میں سے ہر ایک اس صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا جس سے مجھے سابقہ پیش آیا تھا۔ مکتب ارشاد کے ارکان کو تو خاص طور پر ایسی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں جن کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ بعض لوگوں کو ستونوں اور کھمبوں کے ساتھ رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا تھا اور دردناک اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ بعض بے گناہوں کو ٹکٹکی سے باندھ کر مسلسل کوڑے برسائے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو جاتا تھا۔ کئی اخوانیوں کو یخ بستہ سرد راتوں میں بالکل ننگا کر کے ٹھنڈے پانی کے حوض میں پھینک کر ایذا دی جاتی تھی۔ چھت کے ساتھ الٹا لٹکا کر جسم کو ہر جانب سے بید اور کوڑے مارے جاتے تھے۔ بعض اوقات سر پر لوہے کا ہیٹ ڈال کر اسے خوب کسا جاتا تھا۔ پھر چھت سے لٹکا دیا جاتا تھا۔ جنگی قید خانے میں پہلی رات میں نے سخت درد اور اذیت میں گزاری۔ رات بھر ایک لمحے کے لیے بھی میری آنکھ نہ لگی۔ مار پٹائی سے جسم چور چور تھا اور موسم نہایت یخ بستہ۔ سردی سے دانت بج رہے تھے اور جسم کانپ رہا تھا۔ فرش نہایت ٹھنڈا تھا جس پر ایک کمبل بچھا دیا گیا تھا اور اوڑھنے کے لیے کوئی کپڑا نہیں تھا۔ رات کو اگر کسی کو قضائے حاجت کرنا ہوتی تو سیل کے ایک کونے میں پانی کا ایک برتن اور ایک لوٹا استعمال میں لایا جاتا۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ پریشان کیا اور میرے دل کا رہا سہا قرار بھی چھین لیا وہ بے گناہ قیدیوں کی چیخ و پکار اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا شور تھا۔ یہ کارروائی صبح تک جاری رہی۔ صبح کے وقت ہمیں سیل سے باہر نکلنے کا حکم دیا گیا اور جونہی ہم باہر نکلنے لگے ہماری پیٹھوں پر کوڑے برسنے لگے۔ اسی حالت میں ہمیں بیت الخلا تک لے جایا گیا۔

۲۶ نومبر ۱۹۵۴ء صبح سویرے تمام اخوانی نظربندوں کو ان کی چکیوں سے نکال کر کھلے میدان میں جمع کیا گیا۔ پھر ان کی مختلف ٹولیاں بنا دی گئیں۔ ہر ٹولی پر ایک سخت گیر فوجی کو نگران بنایا گیا اور ان

سب کانگران اعلیٰ بدنام زمانہ سنگ دل جلاد امین نامی کو مقرر کیا گیا۔وہ ہمیں پریڈ کا حکم دیتا' پھر اچانک کہتا اکڑوں بیٹھ جاؤ۔پھر تیزی سے اٹھک بیٹھک کرواتا۔اگر کسی بھائی سے غلطی ہو جاتی یا حرکت کرنے میں ذرا تاخیر ہو جاتی تو اسے کوڑوں سے بری طرح پیٹا جاتا اور اس کے ساتھ ایسی فحش گالیاں دی جاتیں کہ جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ہمارے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ بعض نظر بند عمر رسیدہ تھے اور ان کے لیے یہ ابتلا سخت دشوار تھا۔احکام پر عمل کرنے میں سستی کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ان بیچاروں کی چمڑی ادھیڑ دی جاتی اور ان کی کبر سنی کے باوجود ان پر سب و شتم کی انتہا کر دی جاتی۔ گالیاں دیتے ہوئے انھیں کہا جاتا..... کے بیٹے اٹھ تو دشمن کا ایجنٹ ہے۔بس اب تیرا خاتمہ کر کے ہی دم لیں گے..... کبھی کہتے اے فلاں کے بچے تو وزیر بننا چاہتا ہے۔یہ مشقت طلب پریڈ اور اذیت ناک معاملہ ہر روز دو تین گھنٹے جاری رہتا۔

محترم مرشد عام کو زرد رنگ کا لباس پہنایا جاتا تاکہ وہ سب کی آنکھوں کے سامنے نمایاں رہیں۔ بڑھاپے اور علالت کے باوجود انھیں بھی پریڈ میں شامل کیا جاتا۔جب پریڈ ختم ہوتی تو ریڈیو لگا دیا جاتا جس کی آواز مائیکروفون کے ذریعے دور دور تک سنائی دیتی۔اس وقت ریڈیو سے گلوکارہ ام کلثوم کا گانا نشر ہو رہا تھا: "یا جمال یا مثال الوطنیہ" یعنی اے جمال عبدالناصر' اے حب الوطنی کی زندہ مثال۔ یہ ناصر کی شان میں درباری شعرامیں سے ایک شاعر کا قصیدہ تھا۔ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے ہمیں یہ سنایا جاتا۔گانے کے دوران ہمیں حکم تھا کہ قطاروں میں کھڑے ہو جائیں اور بینڈ ماسٹر کے اشاروں کے مطابق اپنے ہاتھوں کو دائیں اور بائیں حرکت دیتے رہیں۔جب ام کلثوم "یا جمال یا مثال الوطنیہ" گائے تو ہم سب بھی بلند آواز سے اس مصرعے کو دہرائیں۔ان مناظر کی فلم بنائی جاتی اور جمال ناصر کو پیش کی جاتی۔وہ اسے دیکھ کر لطف اندوز ہوتا۔ہماری بیکسی سے اسے بڑی لذت ملتی۔ وہ اپنے شیطانی نفس کا اطمینان اسی بات میں پاتا تھا کہ اس کے مخالفین ذلیل و خوار ہوتے رہیں۔

اخوان نے بے شمار مشکلات جھیلیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔عصر حاضر میں وادی نیل کے درندہ صفت حکمرانوں کے مظالم انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔انسانی ضمیر ہر دور اور ہر معاشرے میں ایسے ننگ انسانیت ظالموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تو رہا ہے مگر طاغوت کے سامنے سینہ سپر ہو جانے والے کم ہی لوگ ہوتے ہیں۔اخوان پر مظالم کے متعلق آپ نے جو کچھ پڑھا۔آپ نے اوپر کی سطور میں دیکھا ہے دراصل مظالم اس سے بھی کہیں زیادہ تھے۔الفاظ اس روداد الم کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔مرشد عام اور ان کے ساتھی اگرچہ عصر حاضر کے فرعونوں کے سامنے مجبور ہو کر رہ گئے تھے مگر ان کے دل ایمان کی روشنی اور اسلام کی محبت سے مالا مال رہے۔